محمد منشا یاد

شجر بے سایہ

سہ پہر کا وقت تھا جب نمبردار کی بیوی ست بھرائی اسے اپنے ساتھ لے کر اس کے گھر پہنچانے نکلی۔

وہ میلے میں لٹ جانے اور خالی ہاتھ واپس آنے والے بچے کی طرح آنکھیں جھکائے کھوئی کھوئی ست بھرائی کے پیچھے چل رہی تھی۔ وہ اسے بار بار تسلیاں دے رہی تھی مگر وہ سوکھے پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ وہ چہرہ جس پر گلاب مہکتے اور کلیاں چٹکتی تھیں، ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ اس نے چادر سے سارا بدن، منہ اور سر لپیٹ رکھا تھا مگر اسے اپنے عریانی کا احساس مارے ڈال رہا تھا۔ عورتیں اور لڑکے بالے اسے یوں رک رک کر دیکھ رہے تھے جیسے وہ مداری کے پیچھے چلتی بندریا ہو اور ابھی کسی موڑ پر رک کر کرتب دکھانے لگے گی۔

کاش وہ اسے رات کے اندھیرے میں لے کر آتے۔۔۔۔ اس نے دکھ سے سوچا۔ مگر اب سارے فیصلے دوسروں کے ہاتھ میں تھے۔ اپنا فیصلہ غلط ثابت ہو جائے تو آئندہ فیصلوں کا اختیار خود بخود چھن جاتا ہے۔ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں اور قدم لڑکھڑا رہے تھے جیسے وہ اپنے گھر نہیں جا رہی پھانسی کے تختے کی طرف بڑھ رہی ہو۔ نمبردار اور گاؤں کے سرکردہ لوگوں نے اس کی برآمدگی کے وقت یقین دلایا تھا کہ اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ لیکن وہ اپنے گھر والوں کو جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ کسی طرح زندہ بچ بھی گئی تو اس کا جینا موت سے بدتر ہوگا، وہ اس کے ہاتھ پاؤں ضرور توڑ دیں گے اور وہ کئی روز تک زخموں سے چور کراہتی رہے گی۔

ست بھرائی اس کے آگے آگے اس کے گھر میں یوں داخل ہوئی جیسے فاتح فوج کا جرنیل دارالسلطنت میں داخل ہوتا ہے مگر وہاں کسی نے ان دونوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ماں صحن میں چارپائی پر بیٹھی چاول صاف کر رہی تھی، وہ اسی طرح چپ چاپ چاول صاف کرتی رہی۔ چھوٹا بھائی لکڑیاں چیر رہا تھا وہ بدستور لکڑیاں چیرتا رہا۔ بڑا بھائی صحن کے ایک کونے میں چارپائی کی ادوائن ٹھیک کر رہا تھا، وہ بھی اپنے کام میں لگا رہا۔ صرف بھابی نے اس پر ایک نظر ڈالی مگر ایسی جیسی گھر میں گھس آنے والے پلے پر ڈالتے ہیں۔ البتہ اس نے ست بھرائی کو بیٹھنے کے لئے سرکنڈوں سے بنا ہوا مونڈھا لا کر دیا۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔ ست بھرائی خود ہی باری باری سب کو مشورے دیتی اور نصیحتیں کرتی رہی کہ انسان خطا کا پتلا ہے۔ اس عمر

میں ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے کا درجہ بلند کرتا ہے۔۔۔۔۔وغیرہ وغیرہ

وہ سیدھی پیار میں چلی گئی تھی اور دروازے کے ساتھ لگ کر ایسی جگہ بیٹھ گئی تھی جہاں سے سب کی حرکات و سکنات نظر آ سکیں۔ وہ سب کچھ دیکھتے اور سنتے رہنا چاہتی ا سے ڈر تھا کہ لکڑیاں چیرتا ہوا بھائی کلہاڑا لے کر اس کی طرف بڑھے گا اور اسے سوکھی لکڑی کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔

تھوڑی دیر بعد ست بھرائی جانے لگی تو اس کا دل بیٹھنے لگا' اسے لگ رہا تھا اس کے جاتے ہی وہ اندر آ جائیں گے اور وہ ان سے اپنی زندگی کی بھیک بھی نہیں مانگ سکے گی۔ کچھ مانگنے اور بخشوانے کے لئے الفاظ ضروری تھے اور اس کے پاس پچھتاوے کے آنسوؤں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ مگر جب ست بھرائی کے جانے کے کافی دیر بعد بھی کسی نے اسے برا بھلا نہ کہا کوئی ڈنڈا اچھالتا لے کر اندر آیا تو اسے ہول سا آنے لگا۔ شاید اس کا جرم ایسا تھا کہ کسی چھوٹی موٹی سزا سے اس کی تلافی ممکن نہ تھی۔

شام ہونے کو تھی دریا مو کلہاڑا ایک طرف پھینک کر دودھ دوہنے چلا گیا۔ بڑا بھائی کا موحقہ تازہ کرنے لگا۔ بھابی ننھی صغریٰ کو گود میں لے کر چولہے کے پاس بیٹھ کر چاول پکانے لگی اور ماں رسی پر دھو کر لٹکائے ہوئے کپڑے جمع کرنے لگی۔ کپڑے جمع کر کے وہ اندر آئی اور اس کے قریب سے یوں گزر گئی جیسے وہ اسے دکھائی نہ دے رہی ہو۔ ماں نے کھونٹی سے لالٹین اتاری اور اسے جلا کر دروازے کی چوکھٹ سے لٹکا دیا۔ اسے لالٹین کی روشنی بری لگی جیسے اس نے اسے اور زیادہ عریاں کر دیا ہو۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ مکھی بن کر کسی ٹرنک کے پیچھے جا چھپتی' چیونٹی بن کر کسی سوراخ میں گھس جاتی۔

چھوٹا بھائی دودھ کا برتن سر پر اٹھائے آ پہنچا تو دونوں بھائی چولہے کے پاس بیٹھ کر تھالیوں میں چاول کھانے لگے۔ ماں ننھی صغریٰ کو ٹہل ٹہل کر اور تھپک تھپک کر بہلانے لگی۔

اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ کھانے پینے کا اسے ہوش ہی کب تھا۔ ست بھرائی نے اسے اپنے گھر میں روٹی دی تھی مگر نوالہ اس کے حلق سے نہ اترتا تھا۔ وہ خالی پیٹ اتنی دور سے چل کر آئی تھی مگر اب بھی اسے کھانے کی خواہش محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ پھر بھی اگر کھانا کھاتے ہوئے بھائیوں میں سے کوئی اس کے بارے میں پوچھ لیتا کہ اس نے کچھ کھایا پیا ہے یا نہیں تو وہ بغیر کھائے پیئے جی اٹھتی۔ مگر انہوں نے تو شاید ہمیشہ کے لئے اسے کنبے سے خارج کر دیا تھا۔ مگر بھابی کو بالآخر اس کا خیال آ ہی گیا اس نے تھالی میں چاول ڈالے اور اندر آ کر تھالی اس کے آگے سرکا دی اور کچھ کہے سنے بغیر لوٹ گئی۔ اسے لگا جیسے وہ سچ مچ ایک پالتو کتیا ہو جسے راتب ڈالا گیا ہو۔ وہ اپنے ہی گھر میں اجنبی تھی اس نے بہت کوشش کی مگر اس سے سسکیاں

روکی نہ جاسکیں اس کی سسکیوں اور ہچکیوں کی آواز سن کر بھی کسی کا نوالہ رکا نہ ہی کسی نے اس کا برا منایا۔ وہ رو دھو کر خود ہی چپ ہوگئی۔ اس نے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے چند ایک لقمے بھی زہر مار کیے۔ اسے پیاس لگ رہی تھی۔ بھابی پانی دے کر نہیں گئی تھی اور اسے باہر جا کر نلکے یا گھڑے سے پانی لینے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

باہر کا دروازہ عموماً کھلا رہتا تھا مگر آج اسے بند کر دیا گیا تھا۔ بند دروازہ دیکھ کر اسے اپنا سانس رکتا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہوا کا راستہ روک دیا گیا ہو۔ دو ایک بار کسی نے دستک دی تو اس کی ماں دروازے تک گئی اور باہر بڑبڑاتی ہوئی دروازہ کھولے بغیر واپس آ گئی۔ ضرور گاؤں کی عورتیں آنا چاہتی ہوں گی جن کو برا بھلا کہہ کر ماں نے وہیں سے لوٹا دیا ہوگا۔ اس کے گھر والے پہلے بھی کسی سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے تھے اور اب تو وہ اور بھی بپھرے ہوئے تھے۔

کھانا کھا کر دونوں بھائی صحن میں بیٹھ کر کچھ دیر حقہ پیتے رہے دریا موباڑے میں جا کر سوتا تھا مگر آج وہ گھر پر ہی رہا۔ گامو بھی خلاف معمول جلدی اٹھ کر سونے کے لئے چلا گیا جیسے انہیں جلدی جاگنا اور کسی اہم مہم پر جانا ہو اس کا دل خوف سے دھڑکنے لگا۔

کچھ دیر بھابی صحن میں برتن بھانڈے جمع اور صاف کرتی رہی پھر ننھی صغریٰ کو لے کر وہ بھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ماں برآمدے میں بیٹھ کر تازہ پسایا ہوا آٹا مٹکی میں ڈالنے لگی۔ ماں نے کھانا نہیں کھایا تھا اس نے کھانا کیوں نہیں کھایا تھا یہ سوچ کر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا کہ کہیں گھر میں کچھ ہونے والا تو نہیں تھا۔

لالٹین بجھا کر ماں پسار میں آ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گئی تو اس نے کچھ دیر تامل کیا پھر ہمت کر کے اٹھی اور اس کی پائنتی پر بیٹھ گئی وہ اس کے پاؤں پر سر رکھ کر رونا چاہتی تھی مگر ماں نے پاؤں سمیٹ لئے اور کروٹ بدل لی۔ وہ چپ چاپ سانس روکے اسی جگہ بیٹھی رہی۔ ماں جاگ رہی تھی مگر خود کو سویا ہوا ظاہر کر رہی تھی وہ کئی راتوں کی جاگی اور دن بھر کی تھکی ہوئی تھی اسے پائنتی پر بیٹھے بیٹھے نیند آنے لگی مگر اسے اپنی چارپائی پر اکیلے سونے سے ڈر لگ رہا تھا پتہ نہیں کب چھوٹا یا بڑا یا وہ دونوں بھائی چپکے سے اندر آ جائیں اور اسے ساتھ چلنے کو کہیں وہ چیخنا چاہے گی مگر دونوں اس کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکل سکے گا۔ پھر پتہ نہیں وہ اسے کہاں لے جائیں۔ کس طرح ہلاک کریں۔ ہوسکتا ہے گلا گھونٹ دیں چھری یا ٹوکے سے ذبح کر کے زمین میں دبا دیں۔ کنوئیں یا نہر میں دھکا دے دیں۔ اسے یقین تھا کہ جب وہ اسے لینے آئیں گے تو ماں اسی طرح خاموشی سے خود کو سویا ہوا ظاہر کرے گی وہ اس کی اتنی بڑی خطا کیسے معاف کر سکتی تھی۔ معاف کرنا یا درگزر کرنا اس گھر کے لوگوں نے سیکھا ہی نہیں تھا اور پھر وہ اپنے بیٹوں سے بہت ڈرتی تھی وہ بگڑ جاتے تھے تو ماں کو بھی لہولہان اور بے عزت کر دیتے تھے گھر میں

صرف ایک بھابی تھی جو اس کی جان بچا سکتی تھی مگر وہ کیوں بچاتی۔ اس نے بھابی کے کبڑے بھائی کا رشتہ ٹھکرا کر اسے ہمیشہ کے لئے اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ ویسے بھی وہ قصے کہانیوں کی روایتی بھابی کی طرح اس سے جلتی اور شاید اس کے خون سے ہاتھ رنگنے کی خواہش رکھتی تھی۔

وہ ماں کی پائنتی پر بیٹھی زار و قطار روتی رہی۔ اس کی ماں ضد کی پکی اور دل کی سخت ضرور تھی مگر کبھی کبھی وہ مہربان بھی ہو جاتی تھی یا کم از کم تھوڑی دیر کے لئے نرم پڑ جاتی تھی مگر آج اس کا دل پگھل ہی نہیں رہا تھا۔ پھر پتہ نہیں کب اور کیسے وہ روتے روتے وہیں پائنتی پر گچھا مچھا سی ہو کر سو گئی مگر ڈراؤنے خواب دیکھ دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی سونے اور جاگنے میں اسے کچھ فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ خوابوں نے بھی اسے پناہ دینا چھوڑ دیا تھا۔

اگلے روز اس نے بھائیوں کی نظر سے اوجھل رہ کر گھر کے چھوٹے موٹے کام کرنا شروع کر دیئے۔ برتن اور کپڑے دھوتی' چارپائیاں اور بستر بچھاتی۔ جھاڑو دیتی اور ننھی صغریٰ کو بہلاتی مگر بھابی نے اسے کھانے پینے کی چیزوں کو چھونے سے منع کر دیا تھا۔ تیسرے چوتھے روز اس نے کھانا کھاتے ہوئے بڑے بھائی کے پاس ڈرتے ڈرتے پانی کا گلاس رکھ دیا تو اس نے گلاس اٹھا کر دیوار پر دے مارا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا پھر کھانا چھوڑ کر پاؤں پٹختا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کے بعد وہ پھر سے سہم گئی اور اسے طرح طرح کے اندیشوں نے گھیر لیا۔

وہ گھر میں رہتی تھی مگر گھر کا کوئی فرد اس سے بات نہ کرتی تھا اس نے ماں سے کئی مرتبہ بات کرنے کی کوشش کی مگر ماں جواب نہیں دیتی تھی۔ سوائے ننھی صغریٰ کی ہوں ہاں کے وہ بات کرنے کو ترس گئی تھی۔ ایک رات اس نے ماں کے پاؤں پکڑ لئے اور روتے ہوئے کہنے لگی۔

''ماں مجھے مار مجھ پر تھوک۔ مجھے گالیاں اور طعنے دے۔ خدا کے لئے کچھ تو کہہ''

''میں تیری ماں نہیں ہوں تو کسی کتیا کی اولاد ہے۔''

ماں نے گالی دی تو ناامیدی کے اندھیرے میں امید کا چمکتا ہوا جگنو دکھائی دیا۔۔۔۔۔۔ مگر دوسرے ہی لمحے ماں نے ایک ایسی بات کہہ دی جسے سن کر وہ سناٹے میں آ گئی۔

''تو اس گھر میں مہمان ہے پتہ نہیں کتنے دن کتنی گھڑیاں''

''نہیں ماں۔۔۔۔۔۔ خدا کے لئے ایسا نہ کہو۔''

''اپنی ناپاک زبان سے خدا رسول کا نام مت لے۔''

''میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں ماں۔''

''کچھ فائدہ نہیں۔''

''تو کیا سچ مچ ماں؟۔۔۔۔۔۔''

''ہاں''

''کب؟''

''یہ مجھے پتہ نہیں''

مارے خوف کے اس کا حلق خشک ہو گیا' ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

گاؤں سے قصبے کو جانے والی کچی سڑک پر ایک حویلی تھی۔ جسے کتوں والی حویلی کہا جاتا تھا۔ دو خونخوار قسم کے بولی کتے دن رات حویلی کے ارد گرد گھومتے رہتے تھے۔ ان کے مالکوں کا جب جی چاہتا انہیں باندھ دیتے جب جی چاہتا کھلا چھوڑ دیتے تھے۔ ان کتوں کے ڈر سے لوگوں نے کچی سڑک سے گزرنا چھوڑ دیا تھا اور انہیں قصبے میں آنے جانے کے لئے کھیتوں کے درمیان والی پگڈنڈی کا راستہ اختیار کرنا پڑتا تھا کوئی اجنبی یا بھولا بھٹکا شخص ادھر آ نکلتا تھا تو اسے کتوں سے جان بچانا مشکل ہو جاتی تھی۔ ان کتوں نے کئی لوگوں کو زخمی کیا اور جھنجھوڑا تھا گاؤں والے احتجاج کر چکے تھے' کئی وفد بھیج چکے تھے مگر ان لوگوں پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ گاؤں کے لڑکے جو قصبے کے سکول میں پڑھنے جاتے تھے۔ نہایت بچ بچا کر اور لمبا چکر کاٹ کر وہاں سے گزرتے تھے انہوں نے ان کتوں کے نام بھی گامو اور دریا مور رکھ دیے تھے۔

گامو اور دریا مو کو لوگ نہایت اجڈ اور ظالم سمجھتے تھے جنہوں نے اپنی سگی بہن کو قتل کر کے نہر یا دریا میں بہا دیا یا گڑھا کھود کر کسی کھیت میں دبا دیا تھا اور گاؤں والوں سے ہر قسم کا تعلق توڑ کر گاؤں کی سکونت ترک کر کے یہاں سب سے الگ اس حویلی میں رہنے لگے تھے۔

یہ حویلی کسی زمانے میں مویشیوں کا باڑا تھی وہاں ایک کنواں بھی تھا جسے اب پر کر دیا گیا تھا۔ غفوراں کے روپوش یا قتل ہو جانے کے بعد ان لوگوں نے اس میں چند ایک کمروں کا اضافہ کر کے اسے حویلی کی شکل دے دی تھی۔

گاؤں میں اس حویلی کے بارے میں طرح طرح کے قصے مشہور تھے۔ باغ علی حجام کا کہنا تھا کہ ایک دوپہر کو وہ قصبے کی مشین سے آٹا پسوا کر لوٹ رہا تھا کہ حویلی سے کچھ فاصلے پر کسی عورت نے اس کا نام لے کر پکارا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

دو سے جیسے اعتباری آدمی کا بیان تھا کہ اس نے ایک رات کھیتوں کو پانی لگایا ہوا تھا کہ اس نے دیکھا ایک جواں سال عورت بال بکھرائے کھال کے اندر بے آواز چلتی جارہی تھی اس نے آواز دی تو قہقہہ لگا کر غائب ہوگئی۔ حویلی سے کچھ فاصلے پر ایک بہت اونچا کھجور کا پیڑ تھا بعض لوگوں نے کھجور کے اس پیڑ کے قریب سے بھی عجیب وغریب قسم کی آوازیں سنی تھیں۔ دتو میراثی نے تو ایک چھلیل پیری کو اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی تھا۔

ایک روز چودھری سرور کی بیٹی باپ کا کھانا لے کر کھیتوں میں گئی۔ چودھری سرور آم کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر کھانا کھا رہا تھا اور وہ قریب بیٹھ کر پنکھا جھل رہی تھی کہ اچانک اسے پتہ نہیں کیا سوجھی وہ دوڑ کر درخت پر چڑھ گئی۔ چودھری سرور نے خفا ہو کر ڈانٹا کہ جوان لڑکیاں درختوں پر نہیں چڑھتیں تو وہ جواب میں قہقہے لگاتی اور اوپر چڑھتی جاتی۔ پھر اس نے آم کی ٹہنی سے چھلانگ لگا دی اور گر کر بے ہوش ہوگئی اب وہ بیساکھیوں کے سہارے چلتی تھی۔

لوگوں نے ایسے واقعات اور قصوں کی کڑیاں حویلی سے ملا دی تھیں اور یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ غفوراں کو نہایت بے دردی سے قتل کر کے حویلی کے پاس کہیں ان کھیتوں میں دفن کر دیا گیا تھا اور اس کی بے چین روح بھوت یا چڑیل کی صورت میں وہاں گھومتی رہتی تھی۔ گاؤں میں صرف ایک مولوی فیروز دین تھے جو ان باتوں پر یقین نہیں کرتے تھے اور انہیں ضعیف العقیدہ لوگوں کا واہمہ قرار دیتے تھے لیکن پھر ایک روز ان کے ساتھ نہایت عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ رات کے وقت قصبے سے لوٹ رہے تھے کہ اچانک ان کے آگے آگے ایک دیا روشن ہوگیا۔ کچھ دیر وہ ردِ بلا کے لئے مخصوص دعائیں اور وظیفے پڑھتے رہے مگر جب جلتا ہوا دیا ان کے بہت قریب آ گیا اور ہوا میں تیرتا ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تو وہ ساری دعائیں بھول گئے اور بے ہوش ہو کر کھڈ میں گر گئے۔

بعض لوگوں کا خیال تھا کہ غفوراں کو قتل کر کے نہر یا دریا میں بہا دیا گیا تھا۔ بعض کا خیال تھا کہ اسے گاؤں والے مکان میں قتل کر کے دفن کر دیا گیا۔ یہ مکان اب تک مقفل تھا۔ وہ اسے فروخت کرتے تھے نہ اس کی دیکھ بھال اور مرمت پر توجہ دیتے تھے۔ مگر ساتھ والے گاؤں کے مستری ظہور نے جو حویلی کی تعمیر اور مرمت کا کام کرتا رہا تھا لوگوں کو بتایا تھا کہ حویلی کے اندر گاما اور دریا مو کے گھروں کے عین درمیان ایک چبوترا سا بنا ہوا تھا جس پر سرکنڈوں اور سوکھی ہوئی لکڑیوں کا ڈھیر پڑا رہتا تھا اور جسے گھر کے لوگ ضرورت کے وقت بھی نہیں جلاتے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ چبوترا دراصل ایک قبر تھی اور اسی کی نگرانی کی خاطر ہی وہ لوگ گاؤں والا مکان چھوڑ کر وہاں منتقل ہوئے تھے۔

گاؤں کی عورتیں سکینہ کو بھی چڑیل کے نام سے ہی یاد کرتی تھیں جو اپنی بیٹی کی حفاظت نہ کر سکی تھی اور ماں ہو کر اسے

بدسلوکی سے تنگ آ کر بھاگ جانے پر مجبور کر دیا تھا پھر اس کے عیبوں پر پردہ ڈالنے کی بجائے قتل ہو جانے دیا تھا۔ وہ گاؤں میں بہت کم آتی تھی مگر جب بھی آتی جدھر سے گزرتی سہاگنیں حاملہ عورتیں اور نوجوان لڑکیاں اس کے سائے سے بچنے کے لئے راستہ بدل لیتیں۔ ان کا خیال تھا وہ جسے چھو لے گی یا جس سے بات کرے گی اس کی کوکھ کبھی ہری نہ ہو گی یا گود خالی ہو جائے گی۔ اس کے بارے میں مشہور ہو گیا تھا کہ وہ جس درخت کے نیچے بیٹھ جاتی تھی وہ بے سایہ ہو جاتا تھا۔ گاؤں میں جب بھی کوئی غیر معمولی واقعہ یا حادثہ رونما ہوتا بوڑھی سکینہ اور اس کے خاندان کو اس میں ضرور ملوث کر لیا جاتا۔ بڑی بوڑھیوں نے تو گامو کے ہاں نرینہ اولاد نہ ہونے کو بھی غفوراں کی روح کا انتقام ہی سمجھا تھا اور جب دریا مو کا نوعمر بیٹا سانپ کے ڈسنے سے مر گیا تو اسے بھی اسی انتقامی کارروائی کا حصہ سمجھا گیا جو غفوراں اپنے گھر والوں سے لے رہی تھی۔

سکینہ نے بھی کبھی اپنی صفائی میں کچھ کہنا ضروری نہ سمجھا تھا۔ شروع میں جب لوگ استفسار کرتے تھے تو وہ نہایت مختصر سا جواب دے کر آگے بڑھ جاتی تھی۔

"چلی گئی۔۔۔۔۔۔۔کر ماں ماری آئی تھی۔"

بعض لوگوں نے اس سے یہ مطلب نکالا تھا کہ وہ گھر والوں کی بدسلوکی اور خوف کی وجہ سے دوبارہ بھاگ کر موچیوں کے پاس چلی گئی تھی جو اس کے بھائیوں کے خوف سے روپوش ہو گئے تھے مگر بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ بڑھیا نے نہایت سچے کی بات کی تھی انسان مر کر بھی تو وہیں جاتا ہے جہاں سے آیا ہوتا ہے۔

گاؤں کے بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ یہ خاندان پرانے زمانے کے کسی ایسے غیر ملکی حملہ آور قبیلے سے تعلق رکھتا ہے جو جسمانی خوبصورتی میں لاثانی تھا۔ خصوصاً ان کی عورتیں حسن و جمال میں نہایت ممتاز حیثیت کی حامل ہوتی ہیں۔ چنانچہ جب صغریٰ نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو آس پاس کے دیہات میں ایک بار پھر اس خاندان کے حسن کی دھوم مچ گئی۔

اگرچہ صغریٰ بہت کم حویلی سے باہر قدم رکھتی ہے مگر اب حویلی کے گرد حصار پہلے جیسا ناقابل عبور نہیں رہا۔ دریا مو اور گامو کا ایک دوسرے سے جھگڑا ہو گیا ہے اور وہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں اور ایک دوسرے سے بات تک کرنے کے روادار نہیں ہیں۔ گامو کو نرینہ اولاد نہ ہونے کے صدمے نے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے۔ سکینہ بوڑھی اور کمزور ہو گئی ہے اور اگرچہ وہ دریا مو کے پاس رہتی ہے مگر وہ ماں سے زیادہ صغریٰ کا خیال رکھتی ہے۔ ان کے بوڑھی کتے مر کھپ گئے ہیں۔ ایک بیمار پڑ گیا تھا دوسرے کو کسی نے زہر دے دیا۔ کتے اب بھی حویلی کی رکھوالی کرتے ہیں مگر وہ بھونک کر چپ ہو جانے یا تھوڑی دور تک پیچھا کر کے ہانپ جانے والے عام سے کتے ہیں۔ ان لوگوں کے گاؤں

والوں سے تعلقات بھی بہتر ہو رہے ہیں اور وہ شادی غمی کے موقعوں پر گاؤں میں آنے جانے لگے ہیں۔ صغریٰ اکیلی کہیں نہیں جاتی مگر ماں یا دادی کے ہمراہ کبھی کبھار گاؤں چلی جاتی ہے۔

پچھلے کچھ عرصہ سے حویلی کے گرد منڈلانے والے نوجوان کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے۔ رات کو چاروں طرف سے بانسریوں، الغوزوں اور فراقیہ گیتوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ صغریٰ دن کو بار بار چھت پر آنے جانے اور راتوں کو دیر تک جاگنے لگی ہے۔

یہ سرما کی ایک تاریک اور سرد رات کا قصہ ہے جب آدھی رات کے قریب رابعہ نے اپنے شوہر کو سوتے میں جگا کر بتایا کہ صغریٰ حویلی میں نہیں ہے۔

"کہاں گئی" گامو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"میری آنکھ کھلی تو وہ اپنے بستر میں نہیں تھی۔ میں نے پہلے تو یہی جانا کہ ادھر ادھر ہو گی ابھی آ جائے گی مگر اس کا کچھ پتہ نہیں ہے۔"

"تمہیں اس کا خیال رکھنا چاہیے تھا میں اس کتیا کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

شور سن کر سکینہ بھی جاگ گئی اور لڑکھڑاتی ہوئی آ گئی۔

رابعہ نے لالٹین جلائی۔ گامو نے ٹکوا سنبھالا۔ لالٹین لے کر وہ تینوں کچھ دیر حویلی کے اندر باہر اسے ڈھونڈتے رہے۔ انہوں نے وریامو کے گھر میں بھی جھانکا مگر اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ پھر سکینہ نے مشورہ دیا۔

"تم ترکھانوں کے ہاں جا کر دیکھو ان کا بیٹا فضلوا کثر حویلی کے آس پاس منڈلایا کرتا ہے.......جلدی کرو۔"

گامو ٹکوا لئے اندھیرے میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا گاؤں کی طرف چلا گیا۔ تو رابعہ روتے ہوئے اپنی ساس سے لپٹ گئی۔

"اب کیا ہو گا ماسی؟"

"وہی جو اس گھر میں ہوتا چلا آیا ہے۔"

"نہیں ماسی خدا کے لئے ایسا نہ کہو۔ میری ایک ہی بیٹی ہے۔"

"میرے کہنے نہ کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے میری اس گھر میں کون سنتا ہے؟"

"تم اس کے پیچھے جاؤ ماسی ------ وہ اسے مار ڈالے گا۔"

"نہیں یہ غیرت کا معاملہ ہے وہ میری ایک نہیں سنے گا۔"

ابھی یونہیں بیٹھی تھی جب حویلی کے باہر آہٹ سنائی دی۔ دوسرے ہی لمحے انہوں نے دیکھا وہ اسے ساتھ لئے آ پہنچا تھا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا اس کے بال الجھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا گیا ہے وہ ڈری اور سہمی ہوئی تھی۔

حویلی کا صدر دروازہ بند کر کے گاموں اس کے قریب آیا اور اسے لاتوں اور مکوں سے پیٹنے لگا' وہ زمین پر گر گئی تو وہ دھاڑا۔

''ٹوکا کہاں ہے، میں اس کے ٹکڑے کر دوں گا۔''

صغریٰ ماں کے پاؤں پڑ گئی۔

''مجھے بچالو ماں ۔۔۔۔۔۔ ابا مجھے مار ڈالے گا۔''

''ٹوکا تمہارے پاس پڑا ہے گاموں'' سکینہ نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

رابعہ نے غصے اور نفرت سے اور صغریٰ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ گاموں ٹوکا اٹھانے کے لئے مڑا تو رابعہ نے اسے روک دیا اور بولی۔

''ہوش کرو غصے میں تم پاگل ہو جاتے ہو۔''

پھر اس نے ٹوکا پکڑ کر دور اندھیرے میں پھینک دیا اور زمین پر گری ہوئی صغریٰ کو سہارا دے کر اندر لے گئی۔

''میں دیکھ رہی ہوں گاموں ۔۔۔۔۔۔'' سکینہ بولی'' یا تو تم بوڑھے اور کمزور ہو گئے ہو یا بے غیرت۔''

''ہاں ......!'' گاموں نے مرجھائے ہوئے لہجے میں کہا اور نادم سا ہو کر اندر چلا گیا۔

جب وہ اپنے اپنے بستروں میں لیٹ گئے تو انہیں چبوترے کی طرف سے بلند آواز میں بین کرنے کی آواز سنائی دی۔

''کرماں مارئیے غفوراں ۔۔۔۔۔۔ اس رات تیرا باپ بھی زندہ ہوتا تو تیری فریاد سن لیتا۔''

پھر اس کے دو ہاتھوں سے چھاتی پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں جیسے غفوراں ابھی ابھی قتل ہوئی ہو۔

